Date of Publication:23-10-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 Oct. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 November 2013
Issue: 41, Vol.: 72

یکم تا ۷ رنومبر ۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر: ۴۱، جلد نمبر: ۷۲

اداریہ

انتخابات کا جمہوری عمل اور اردو کے حقوق کی خاطر اہلِ قلم کے تحرک کا مسئلہ

ان چار صوبوں — دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ — میں اسمبلی انتخاب کا بگل بج چکا ہے جہاں قابل ذکر اردو آبادی ہے۔ پانچویں صوبہ میزورم میں اردو والے نا کے برابر ہیں۔ ان انتخابات کے ختم ہوتے ہوتے لوک سبھا انتخابات کی تیاریاں شروع ہو جائیں گی یعنی اب سے لے کر آئندہ مئی، جون تک ماحول میں سیاسی گہما گہمی رہے گی۔ میڈیا کا غیر معمولی عمومی پھیلاؤ اور دن رات، ہر روز، ٹی وی کے مختلف چینل ہندستان کی رائے عامہ کو بیداری کے ایک نئے دور میں لے جانے کے لیے تیار ہیں، بلکہ یوں کہیں کہ ہمیں اور آپ کو متاثر کرنے اور اپنا ہم خیال بنانے کے لیے بے تاب! نہ صرف سیاسی پارٹیوں کے مختلف شعبے بلکہ کروڑوں کی تعداد میں انٹرنیٹ پر عوامی یا ذاتی طور پر متحرک لوگ، جو ہندستان کی سول سوسائٹی کے مختلف مسائل اور زاویوں پر مسلسل بحث و تمحیص میں مصروف ہیں، الیکشن کی معنویت اور اہمیت کو کہیں زیادہ بڑھا دیں گے اور ان انتخابات کے نتیجے میں ہماری جمہوریت کی معنوں اور زیادہ صحت مند روایت سے ہم کنار ہوگی۔

اردو آبادی، اردو دانشوروں، اردو کے رضاکار اداروں، نجی طور پر فعال ادبی انجمنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس موقعے کا پورا فائدہ اٹھائیں اور صوبائی سطح سے لے کر لوک سبھا کے الیکشن تک مختلف سیاسی جماعتوں کو اردو کے مسائل سے واقف کرائیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انھیں مجبور کریں کہ اول تو وہ اپنے انتخابی منشور میں اردو کو جگہ دیں اور وعدہ کریں کہ اگر وہ اقتدار میں آئیں تو اردو — خصوصاً اردو تعلیم کے نفاذ — کے لیے کیا کریں گی۔ اردو اداروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ سیاسی جماعتوں کو باور یہ بات بتائیں کہ وہ اردو اور مسلم مسائل کو ایک ہی سکّے کے دو رخ نہ سمجھیں۔ اس سے اردو اور مسلمان دونوں کو نقصان ہوگا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اب اردو پڑھنے والے طلبہ، اردو پڑھانے والے اساتذہ اور اردو کے اہل قلم کی اکثریت مسلمانوں پر مبنی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ جب آزادی کے بعد حکومت تقسیم سے پیدا شدہ حالات کے سبب ہندو اکثریت کو خوش کرنے کے لیے اردو کو ختم کرنے پر آمادہ تھی، اس وقت مسلمانوں نے اردو کا تحفظ صرف دینی مدارس کے ذریعے کیا مگر پھر بھی یہ کہنا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور دینی مدارس اردو کا تحفظ کر رہے ہیں ایک انتہائی پیچیدہ صورت حال کا بہت ہی سطحی تجزیہ ہے۔ اس طرح کی باتیں حکومت کو اس بات کی کھلی چھوٹ بھی دیتی ہیں کہ وہ اردو کے لیے کچھ نہ کرے۔

ہمیں خوشی ہے کہ یہ نہایت درست بات اب بار بار دہرائی جا رہی ہے کہ اردو کا احیا صرف اور صرف اسکولوں میں تعلیم کے ذریعے ممکن ہے۔ اردو آبادی معاشی طور پر نہایت ہی پسماندہ ہے۔ وہ اردو ذریعہ تعلیم کے لیے اپنے وسائل سے اسکول تو نہیں کھول سکتی مگر وہ حکومت کو اس بات کے لیے یقیناً مجبور کر سکتی ہے کہ ایسے اسکول کھولے جائیں جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اپنی اقتصادی پسماندگی کے سبب ملک کی اردو آبادی کے لیے یہ بھی ممکن نہیں (جو ملک کے تقریباً ہر خطے میں ہے لیکن منتشر طور پر) کہ وہ سرکاری اسکولوں میں یا پھر غیر اردو منتظمہ کے تحت چلنے والے اسکولوں میں اردو مادری زبان والے بچوں کے لیے پہلی اور لازمی زبان کے طور پر — جو ان کا آئینی حق ہے — اردو تعلیم کا نظم اپنے طور پر کرے۔

ہندستان جیسے غریب ملک میں جہاں اسّی (۸۰) فی صد سے زیادہ بچے براہ راست یا بالواسطہ حکومت کی امداد کے ذریعے چلنے والے اسکولوں میں پڑھتے ہیں، وہاں اردو آبادی کے درمیان اس بات کی تبلیغ کرنا کہ اردو والے اردو تعلیم کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیں، عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر کہیں اردو والے ایسا کرنے پر مقدور بھی ہوں تو بھی کہ ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو اسکول کے ہمہ گیر ترقی نظام کی برکتوں سے محروم ہونا پڑے گا۔

یہ سچ ہے کہ گذشتہ چالیس برس میں اردو کے کم و بیش تمام ادارے ریاست کی گرفت میں آ گئے اور تقریباً ہر اہل قلم ان سے براہ راست یا بالواسطہ فیض یاب ہو کر یہ کہنے لگا کہ اب اگر اس نے اردو کے حق میں آواز اٹھائی تو وہ حکومت کے فیض سے محروم ہو جائے گا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ یونی ورسٹیوں میں زیر تعلیم اردو طلبہ تک اتنے دور اندیش ہو گئے کہ انھیں حکومت کے مفادات کا خیال حکومت سے کہیں زیادہ ہونے لگا۔ نتیجتاً اردو کے حق میں معروضی اور موثر آوازیں ناپید یا تقریباً معدوم ہو گئیں۔ ایک وقت تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کہکشاں اردو ہی نہیں، ہر اہم سیاسی معاملے پر حکومت کے خلاف آواز بلند کرتی تھی۔ انجمن سے وابستہ اہل قلم — جن میں اردو کے شاعر و ادیب سب سے آگے تھے — کے لیے جیل کا سفر فخر و انبساط کا سبب تھا۔ اب وہ انجمن خدا جانے کہاں غائب ہو گئی ہے! ضرورت ہے کہ اس موقعے پر جب ملک پر فاشزم کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں اردو والوں کے لیے — جن میں اردو کے اہل قلم، اردو دانشور، اردو کے اساتذہ اور خصوصاً یونی ورسٹیوں اور ملحقہ کالجوں میں بی۔ اے۔ آنرز، ایم۔ اے۔ اردو (ادب)، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طالب علم بھی شامل ہیں — ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اردو کے حقوق کے لیے سیاسی محاذ آرائی کریں بلکہ وسیع تر جمہوری عمل میں شامل ہو کر ہندستان کے فسطائی اداروں کے مقابل سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ قومی اردو کونسل کے سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے سید محمد اشرف نے جو ایک نہایت اہم سرکاری عہدے پر متمکن ہیں جو بات کہی وہ ہمیں ترغیب دیتی ہے کہ ہماری امیدوں کا مرکز کچھ لوگوں کی سرکاری وفاداری کا لایعنی عمل نہیں بلکہ جمہوری عمل میں اردو عوام کی مجموعی شرکت ہونا چاہیے۔ سرکار کا ناکام دم بھرنے اور اس خیال کا ہم نوا ہونے سے کہ چپ ہی رہنے میں ہماری عافیت ہے، اردو والوں کا اب تک بے اندازہ نقصان ہو چکا ہے۔ اب ضروری ہے کہ اردو والے اپنا لائحہ عمل تبدیل کریں۔ اشرف صاحب کے معروضات ملاحظہ کیجیے: "...میں اردو مخالف قوتوں کی سازشوں کو نظر انداز نہیں کر رہا ہوں جن کا سلسلہ ایک صدی سے زیادہ پر محیط ہے۔ ان قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جمہوری طرز پر شدید جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس طرح کی شدید جدوجہد کو ہندستان کی سول سوسائٹی ایک نہایت موثر آلے کے طور پر قبول کر چکی ہے۔ افسوس کہ اردو کے سیاق و سباق میں ایسی کسی جدوجہد کی آہٹ ہمیں دور دور تک نہیں سنائی دیتی۔ جارحانہ یا شدید جدوجہد تو ایک طرف، کسی بھی جدوجہد سے بے نیاز اردو والے اب صرف اس خیال کے ہیں کہ بس اب حکومت سے چلنے والے ادارے اردو کی تعلیم و تدریس، ثقافت و تہذیب — ہر چیز کا تحفظ کریں گے۔ میں اردو عوام، قائدین اور دانش وروں کے اس رویے پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا...!"

میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقاصد اور ان لوگوں — جو ان مقاصد سے اتفاق نہیں رکھتے تھے — کے اس خیال پر اس وقت کوئی رائے زنی نہیں کروں گا کہ لکھنے والے کو سماجی مقاصد کے تحت لکھنا چاہیے یا نہیں، اسے سیاسی تحریک کا حصہ نہ ہو کر صرف اور صرف ادب عالیہ کی تخلیق کرنا چاہیے۔ ان مباحث کو اب زمانہ گزر گیا اور نئے بین الاقوامی محرکات جو ہر ملک کی داخلی سیاست پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں، جن میں اب ادیب اور لکھنے والے ایک بالکل ہی نئے سیاسی، سماجی اور معاشی منظر نامے کا حصہ ہیں، کے بیدار ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ ہندستان میں اردو کے علاوہ ہر زبان کے لکھنے والے سیاسی تحریک کا حصہ ہیں۔ لیکن اس وقت بھی جب خصوصاً جدیدیت کی طرف سے ترقی پسند ادب میں تصور کے موضوع پر بحث ہو رہی تھی، شمس الرحمان فاروقی نے نیشنل رائٹرز فورم میں ایک اعلا عہدہ قبول کیا جو نہ صرف مبارک بات تھی بلکہ اس امر کی کھلی دلیل بھی کہ لکھنے والا اپنے سیاسی و سماجی حالات سے لاتعلق رہ ہی نہیں سکتا۔ کاش اس مشکل وقت میں اردو کے تمام اہل قلم متحرک ہو جائیں تاکہ اردو کے ادارے بھی سیاست سے بے نیاز ہو کر اگلے پانچ برسوں تک اس حاشیے پر اور نہ بیٹھے رہیں جس پر وہ گذشتہ 65 برسوں سے ٹریفک پر سوار مجبور شخص کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

اطہر فاروقی

دوسری قسط

فعلِ متعدّی

فہمیدہ ریاض

اچھا تو کبیر، یوں ہی سہی، تو اب سنو۔

مولوی عبدالحق نے ڈکشنری پر کام تو بہت پہلے شروع کر دیا تھا، پاکستان بننے سے بھی پہلے لیکن بعد میں جب وہ پاکستان آگئے تو کچھ عرصہ انجمن ترقی اردو کے ساتھ کام کرتے رہے۔ پھر ۱۹۵۸ء میں اردو ڈیولپمنٹ بورڈ بنا اور ڈکشنری کا کام باقاعدہ شروع ہوا۔ اس کی لائبریری میں جو قدیم کتابیں اور مخطوطات ہیں وہ غالباً مولوی صاحب نے ہی جمع کی تھیں۔ اپنی کتابوں کا ذخیرہ وہ ہندستان سے ساتھ لے آئے تھے۔

پھر ایوب خاں کا دور شروع ہوا اور پاکستان کا دارالخلافہ نو تعمیر شہر (یا چھاؤنی) اسلام آباد لے آیا گیا۔ کراچی میں رہ جانے والا یہ ادارہ اس کے بعد عجیب کس مپرسی کا شکار رہا۔ عشرہ بعد عشرہ اس کے عہدے ختم کیے جاتے رہے۔ اردو کے متعدد عالم بہرحال اس سے چمٹے رہے، رفتہ رفتہ ان میں کئی دنیا سے رخصت ہوئے لیکن ڈکشنری کا کام آہستہ آہستہ جاری رہا۔ گو اسلام آباد میں وزارتِ تعلیم کو اس سے چنداں دل چسپی نہیں رہی تھی۔ وہ اسے ایک خواہ مخواہ کا ادارہ سمجھنے لگے، اپنے بجٹ پر ایک فضول بوجھ! یہاں اب جو لوگ آچکے تھے وہ اکتا کر پوچھتے تھے کہ آخر ڈکشنری ختم کیوں نہیں ہو رہی؟ کیا یہ بڑے جان بوجھ کر کام کو لمبا نہیں کیے جا رہے؟ سوچتے ہوں گے ڈکشنری ختم ہوگی تو ان کی نوکریاں بھی ختم ہو جائیں گی۔

رفتہ رفتہ اس ادارے کا تمام تر انتظامی ڈھانچہ ختم کر دیا گیا حتیٰ کہ یہاں کسی اکاؤنٹنٹ تک کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، مالی، نائب قاصدوں اور لوئر ڈویژن کلرک کے علاوہ اب یہاں صرف لغت نویس تھے۔ چند ڈسٹری بیوٹر اور کمپوزیٹر تھے جو اس زمانے میں رکھے گئے تھے جب ابھی دھات کے حروف سے چھپائی ہوتی تھی۔

کئی برس تک لغت نویس اکاؤنٹینسی کرتے رہے اور ملازمین کی چھٹیوں کا حساب رکھتے رہے۔

تب عورت نے کچھ کارکنوں کو طلب کیا۔ وہ سہمے ہوئے داخل ہوئے۔

"اے وہ شخص، جس نے کل مجھے بجٹ دکھایا تھا، سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟"

"میں کمپیوٹر آپریٹر ہوں حضور"۔

نوجوان نے ادب سے جواب دیا۔

"یعنی کمپیوٹر پر کمپوز کرتے ہو؟"

"نہیں تو...!" اس نے کہا۔

"پھر کیا کرتے ہو؟"

"اے جی پی آر میں ہر مہینہ اخراجات کی برابری کرتا ہوں۔ بجٹ بناتا ہوں، یعنی اکاؤنٹینسی کا تمام کام کرتا ہوں"۔

"اور تم؟" عورت نے ایک لغت نویسہ سے پوچھا۔

"جی میں... ایسا ہے کہ میں انتظامیہ کے دیگر امور نمٹاتی ہوں، منسٹری سے خط و کتابت بھی تو کرنی پڑتی ہے"۔

"وہ انگریزی میں ہوتی ہے ناں؟ لیکن تمھیں تو انگریزی ٹھیک سے نہیں آتی"۔

"باہر سے لکھواتی ہوں محترمہ..."

لغت نویسہ نے رو کر کہا۔

"تم بھی باہر سے کام کرواتے ہو؟" عورت نے کمپیوٹر آپریٹر سے پوچھا۔

"نہیں..." اس نے کہا۔ "میں تو سیکھ ہی گیا سب کام، جب سر پر پڑتی ہے تو کرنا ہی پڑتا ہے"۔

عورت نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک اچھی شخصیت کا نوجوان تھا۔ مخلص، توانائیوں سے مملو، آگے بڑھنے کا مشتاق۔

تب اس نے ایک لمبا سانس بھر کر کہا۔ "اب آپ جا سکتے ہیں"۔

گویا "تخلیہ" کہہ کر تالی بجائی۔

پھر اس نے مولوی صاحب کو جادو سے بلایا۔

"میں فعل متعدی سے ناواقف ہوں"۔ اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "لیکن جو میں کر سکتی ہوں وہ اب کرنے جا رہی ہوں"۔

اتنا کہہ کر وہ وزارتِ تعلیم کے سکریٹری کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

"یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ سالہا سال سے ایک ادارے کی یہ درگت بنادی گئی ہے کہ اس کے انتظامی ڈھانچے کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا گیا۔ فوری طور پر... بالکل فوری طور پر اس کو ری اسٹرکچر کیا جائے... ورنہ!"

تب انھوں نے فون کیا تھا "ہمارا ایک بندہ آرہا ہے"۔

اور یہ لغت نویسہ تھی کہ جب سے میں آئی تھی روئے چلی جا رہی تھی۔ میرے آنے سے پہلے وہ قائم مقام مدیرِ اعلا تھی۔ اسے امید دلائی گئی ہوگی کہ بالآخر وہ سچ مچ ترقی دے کر مدیرِ اعلا بنا ہی دی جائے گی کہ اچانک مجھے اس پر نازل کر دیا گیا۔ لہٰذا وہ اپنی پرانی کرسی پر بیٹھی روئے جا رہی تھی۔

عورت نے دوسری عورت کو ڈانٹا۔

"اب بند کرو یہ رونا دھونا۔ تمھارے کوئی بھی اختیارات ختم نہیں کیے جا رہے۔ تمھاری پہلی حیثیت برقرار ہے۔ اب روئیں تو اسے ہی آکر خراب کروں گی"۔

"میں نے بتیس برس یہاں کام کیا ہے"۔ لغت نویسہ نے سہم کر کہا۔

"بتیس برس!" عورت نے مرعوب ہو کر دہرایا۔

"تو میں تمھاری پروموشن کرواتی ہوں۔ اس کے لیے اس ادارے میں نئی پوسٹ بنانی پڑے گی"۔

دوسری عورت خاموشی سے باہر چلی گئی اور نئی آنے والی کے خلاف خاموش سازشوں میں مصروف ہو گئی۔

"شاباش! کچھ تو کرو"۔ میں نے کہا۔ "ات از اونلی نیچرل!"

اس کے آگے گلیاں تھیں اور گلیارے... اور ہر گلی ایک بند گلی تھی، جن میں کاڑھا کہرا اترا رہا تھا۔

"یہاں کچھ پروموشنز کیے جائیں۔ نئی پوسٹیں دیجیے"۔

"مگر یہ پرانے سروس رولز میں نہیں آتے"۔

"تو نئے سروس رولز بنا لیتے ہیں"۔

"آپ بنائیں گی؟"

"ہاں! آپ کی مدد سے"۔

"تو یہ کاغذات لے جائیے۔ پھر ہمیں خط لکھیے گا"۔

"پھر آپ مجھے خط لکھیں گے۔ پھر میں آپ کو خط لکھوں گی۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تب تک یہ حکومت ختم ہو جائے گی۔ میں خط و کتابت کی شوقین نہیں۔ سروس رولز اسی دفتر میں، آپ کی موجودگی میں بنا لیتے ہیں"۔

سیکشن آفیسر سخت گھبرایا۔

"نہیں جی۔ یہ یہاں نہیں بن سکیں گے"۔

"تو کہیں اور چلتے ہیں"۔

اس پر پاس کھڑا نائب قاصد، یعنی کبوتر ہنس پڑا۔

سیکشن آفیسر خوب شرمایا، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ عورت کے ساتھ بیٹھ کر نئے سروس رولز بنانے پر تیار ہو گیا۔ چار پانچ دن میں سروس رولز بن گئے۔

عورت انھیں لے کر خوشی خوشی سکریٹری ایجوکیشن کے پاس پہنچی۔ سکریٹری ایک نازک ڈیل ڈول کے انسان تھے۔ ان کے نقوش بھی نازک اور دل چسپ تھے۔ گھنے ابرو اور پلکیں، چمکتی آنکھیں، خوب فراخ دہانہ، لمبی سی ستواں ناک جو اوپر کی طرف مڑی ہوئی تھی۔ گویا ان کا ایک "ونڈریزی" قسم کا چہرہ تھا۔ عورت کو یہ بات دل چسپ لگتی تھی۔ اس نے پنجاب میں چند ایسے دوسرے چہرے بھی دیکھے تھے۔ پنجاب میں نسلیں کسی وجہ گھلو ملا ہیں۔ اس نے سوچا اور سروس رولز ان کی طرف بڑھا دیے۔ سکریٹری ایک خوش مزاج بھلے مانس تھے۔ وہ عورت سے شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے ہمدردی سے کاغذات پر نظر ڈالی اور کہا۔

"آپ نئے عہدے مانگ رہی ہیں۔ پرانے عہدوں کی ہی خیریت نہیں"۔

پھر انھوں نے کہا۔

"آپ فنانس اور اسٹیبلشمنٹ سے ملیے"۔

اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کا مینجمنٹ اور سروسز پر، یعنی ونگ۔ ہر وزارت کی پروں سے اڑتی ہے۔

جوائنٹ سکریٹری ایک مائل بہ فربہی، چالیس کے پیٹے میں، ایک اداس اور کچھ فلسفیانہ خو بو کی شخصیت نکلے۔ انھوں نے اداسی سے مجھے دیکھا۔

"کیا آپ اس ادارے کی پنشنوں کی ادائیگی کے لیے آئی ہیں؟"

"نہیں... لیکن وہ بھی ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔ وہ فائل بھی لائی ہوں"۔

"لیکن محترمہ... یہ ادارہ تو بائیس برس سے ہمارے نزدیک... وجود نہیں رکھتا"۔

"وجود نہیں رکھتا؟ مگر یہ تو ہے"۔

"کیا ثبوت ہے"۔

"ابھی یہ باقاعدہ ہے۔ کوئی پچپن لوگ کام کر رہے ہیں یہاں"۔

"یہ وجود کا ثبوت نہیں"۔

"تو پھر کیا ہے؟"

"بائیس برس پہلے، یعنی ۱۹۶۸ء میں وزارتِ تعلیم نے اس کے کارکنوں کے وجود کے تسلسل کے لیے ہم سے رابطہ نہیں کیا"۔

"اور تب سے اب تک نہیں کیا؟"

"نہیں... لہٰذا جہاں تک ہمارا تعلق ہے، مالی سے لے کر لغت نویسوں تک، کوئی عہدہ وجود نہیں رکھتا"۔

"نہیں رکھتا... لیکن انھیں ہر سال بجٹ مل جاتا ہے۔ اس میں سب کی تنخواہیں ہوتی ہیں"۔

"اس کے لیے وزارتِ معیشت سے پوچھیے"۔ جوائنٹ سکریٹری نے اضمحلال سے کہا۔

منسٹر وزارتِ معیشت گہرے سانولے چہرے پر تھکن کے آثار... چہرے کے موزوں نقوش پر قبل از وقت بڑھاپے کی پرچھائیں۔ کمرے کے در و دیوار سے فائلیں گویا اُگ رہی تھیں۔ ہر گوشے میں اور تمام میزوں پر فائلوں

کے اجار تھے۔ ان کا ایک نیم دیہاتی پختون اسسٹنٹ ایک قدیم صوفے پر براجمان۔

"میں ذرا وضو کرنے جا رہا ہوں"۔

عورت نے سینے پر ہاتھ رکھ کر آمنا وصدقنا کہا۔

انتظار طویل تھا... دراصل وہ نماز پڑھنے گئے تھے۔ کہتے ہوئے ہچکچائے۔ اس ہچکچاہٹ کی عورت نے دل سے قدر کی۔ بالآخر وہ واپس پہنچے۔

"ایجنٹ اور سروسز ونگ سے کاغذات ہمارے پاس آتے ہیں، چوں کہ وہاں نہیں پہنچے اس لیے ہمارے نزدیک بھی بائیس برس سے اس ادارے کا وجود نہیں ہے"۔

"لیکن آپ ہر سال انھیں تنخواہیں دیتے ہیں"۔

"ہمارے پاس کسی کمپیٹنٹ اتھارٹی نے یہ ہدایات نہیں بھیجی ہیں کہ بجٹ دینا بند کر دیا جائے۔ اس لیے بجٹ جاری کرتے رہتے ہیں"۔

عورت چکرا کر انھیں دیکھتی رہی۔

"مگر تنخواہوں میں اضافہ یا پروموشن... یا نئے عہدے... اس کے لیے وجود کا ثبوت درکار ہے"۔ انھوں نے کہا۔

عورت مبہوت ہوکر جوائنٹ سکریٹری کو تکتی رہی، پھر اسے شدید غصہ آیا۔ یقیناً یہ تو اردو سے دشمنی تھی۔ "اردو سے یہ انکھیاپا" اس کے دماغ نے سوچا جس میں سندھی بھری تھی۔ تب ہی جوائنٹ سکریٹری نے کہا۔

"ہمارے پاس ایسا ہی ایک دوسرا کیس ہے"۔

"کون سا کیس؟"

"سندھ مدرسہ"۔

سندھ مدرسہ! عورت مبہوت ہوکر رہ گئی۔ مسٹر جناح کا اسکول! یہ تو کوئی دکھ، چیستان تھا!

"جی ہاں۔ بائیس برس سے ہمارے نزدیک اس کا بھی وجود نہیں ہے لہٰذا کوئی پروموشن یا تنخواہوں میں اضافہ نہیں ہوسکتا"۔

یااللہ! عورت نے ایک لمبی سانس بھری۔ یہ جناح کا اسکول تھا؟ اس کی یہ درگت!! اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حالاں کہ اس نے پہلے کبھی مسٹر جناح کے بارے میں نہ سوچا تھا۔ لیکن اس گھڑی، برنس روڈ کے ۱۹۴۷ء سے بنتے ہوئے مرغی پایوں اور لکھنوی کبابوں کے دکانوں سے گھرے، سنگِ خارا کی اس خوب صورت پُرتمکین عمارت کی محرابیں اور ستون اس کی نظر میں گھوم رہے تھے جہاں محمد علی نامی ایک دبلا پتلا پڑھاکو لڑکا گھومتا پھرتا ہوگا، اور جس نے....

"قائداعظم کے اسکول کے ساتھ یہ سلوک کرتے آپ کو شرم نہ آئی... کس قدر مختلف حکومتیں قائداعظم کے نام پر بک بک کرتی ہیں! جب کہ حقیقت یہ ہے؟"۔

یہ ڈوردار ڈانٹ وہ پلانا چاہتی تھی، لیکن ایسا کچھ بھی اس نے نہ کیا۔ اس کا فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی دانت پیستی رہی۔

"بہرحال ہم آپ کی کوشش کی قدر کرتے ہیں اور آپ کو خط لکھیں گے"۔

قصہ ختم اور پیسہ ہضم۔ ایک قول محاورہ۔

عورت ہنکاتی ہوئی واپس آگئی۔

چیزوں کا ہونا یا نہ ہونا... کسی ثبوت پر منحصر ہے کہ کس نے ان کو کیا۔ کسی نے تو کیا ہوگا۔ اپنے آپ سے تو نہیں ہوگیا ہوگا! لیکن ایسا ریکارڈ میں نہیں ہے۔

کیوں نہیں ہے؟

کوئی افسر کاغذ فائل کرنا بھول گیا اور اس طرح وجود غیر قانونی ہوگیا۔

بائیس برس پہلے... اب بائیس برس پہلے کیوں کر پہنچا جاسکتا ہے۔

بائیس برس کی فائلوں کی چھان بین کا آغاز۔

وزارت فنانس کے سوال:

۱۔ کون سی کمپیٹنٹ اتھارٹی نے اسے کب بنایا۔

۲۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟

۳۔ وہ خط کہاں ہے جس سے اس کا ہونا ثابت ہو؟ ہمارے پاس تو نہیں۔

اب دیکھیے! ابھی تو کوشش میں کر رہی ہوں۔

مولوی عبدالحق صاحب!

مولوی عبدالحق! وہ بیچارے مولوی کسی طرح اور کسی طرف سے بھی نہیں تھے۔ یہ تو مشرقی مدرسوں کی ایک ڈگری ہوتی تھی جیسے ادیب فاضل ہوتا تھا۔ میری آپا نے شادی کے بعد اور ایک بچے کی پیدائش کے بعد ادیب فاضل کرنے کی کوشش کی تھی، یہ شام کی کلاسیں ہوتی تھیں اور پچاس کے عشرے میں، حیدرآباد میں ایک زنانہ باغ میں کھولی گئی تھیں۔ تقسیم سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا پارک تھا جسے لیڈیز پارک کہا جاتا تھا۔ یہ جگہ دن کے وقت ایک اسکول کو دے دی گئی اور شام کو یہاں ادیب اور ادیب فاضل کی کلاسیں ہونے لگیں۔ مجھے یاد ہے کیوں کہ ایک برس تک جب میری آپا ریشمی کالا برقعہ اوڑھے، اپنے گل گوتھنے بچے کو گود میں لیے ان کلاسوں میں جاتی تھیں تو میں بھی ان کے ساتھ جایا کرتی تھی تاکہ وہ راستے میں اکیلی نہ ہوں۔ پھر یہ کلاسیں اور یہ طرز تعلیم رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ مولوی، جس کا مطلب حضرت آقا و آقائے نامدار ہوتا ہوگا لوگوں کی یادداشت سے محو ہوگیا اور شاید بعد میں لوگوں نے عبدالحق صاحب کو مسجد کا مولوی ہی سمجھا ہو کہ یہ تو اب ان کے نام کا حصہ ہوگیا تھا۔

عبدالحق جیسا کہ میں اب پڑھ رہی تھی، علی گڑھ یونیورسٹی کے اثر میں سرسید کی طرح تقریباً 'نیچری' تھے۔ رہائش گاہ کی کھڑکی کھول کر سوتے تھے جیسے پیدا ہوئے ہوں۔ ہاں وہ اردو کے دل و جان سے دلدادہ تھے۔ اردو... جیسا کہ عبدالحق اسے جانتے تھے۔ اردو سے ان کے عشق کی جڑیں تیس اور چالیس کے عشرے میں یوپی، سی پی میں ہونے والے اردو ہندی تنازع میں تھیں۔ پاکستان میں نہیں تھیں۔ عبدالحق کے اجداد عرب یا ترک یا ایرانی مہاجر نہیں تھے۔ وہ خالص برہمن تھے اور مغلوں کے دور سے قانون گوئی ان کا موروثی پیشہ بن گیا تھا۔ تب ہی ان میں سے چند مسلمان ہوئے، شاہجہاں یا شاید جہانگیر کے زمانے میں۔ شاید یہی برہمن اور مسلم وغیرہ وغیرہ اردو کی تشکیل کر رہے تھے۔ جتنی صدیوں میں کیا ہوا اور کیسے ہوا اس کے بارے میں مکمل یقین سے کیا دعویٰ کیا جاسکتا ہے، پھر بھی یہ لگاؤ مذہبی نہیں بلکہ تہذیبی معلوم ہوتا ہے۔

میری عبدالحق سے پرانی بچپن کی پہچان تھی۔ جب میں اسکول میں پڑھتی تھی تو ہماری اردو کی نصابی کتاب میں ان کا ایک مضمون یا قصہ تھا کہ 'نام دیو مالی' بھی تھا۔ یہ ایسے مالی کی کہانی تھی جو اپنے کام میں دل و جان سے غرق رہتا تھا۔ ایک دن شہد کی مکھیوں کا ایک جھنڈ کا جھنڈ اس پر حملہ آور ہوا۔ نام دیو پودوں کی دیکھ بھال میں ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ اسے شہد کی مکھیوں کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ مکھیوں نے اسے اس بری طرح کاٹا کہ نام دیو سخت بیمار ہوگیا اور پھر جانبر نہ ہوسکا۔ مولوی عبدالحق نے اس کہانی میں لکھا تھا: "میری نظر میں نام دیو ایک شہید ہے"۔

یہ کہانی مجھے اتنی اچھی لگی تھی کہ آج تک یاد ہے۔ اس کہانی کی سادہ اور دل نشیں زبان، نام دیو مالی کا چمن، اس کی موتیا چنبیلی اور موگرے کی جھاڑیاں اور کیاریوں پر جھکا، کھرپی سنبھالے نام دیو مالی... سب کچھ جیسے زندہ معلوم ہوتے ہیں۔ پھر زندگی بھر میں نے ان کی کوئی دوسری تحریر نہیں پڑھی اور اب... جب خود میری زندگی ختم ہو رہی ہے، یا اب ایسا ہونا چاہیے، کتنی عجیب بات کہ میں ان کو سمجھنے اور بوجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

وزارت کے نام ڈکشنری بورڈ کا خط:

محترم سکریٹری صاحب

آداب!

میں ۲۲ جولائی ۲۰۰۹ء کو اسلام آباد سے کراچی پہنچی۔ اسلام آباد میں آپ سے مشاورت کے ساتھ میں نے وزارت تعلیم کے افسران اور اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کے ڈپٹی سکریٹری، منسٹری آف فنانس اور فنانشل ایڈوائزر سے اردو ڈکشنری بورڈ کے بارے میں بات چیت کی۔

آپ سب نے جس خلوص اور خندہ پیشانی سے میرے ساتھ تعاون کیا اس کا تہِ دل سے شکریہ قبول کیجیے۔ آپ لوگوں کی رہنمائی میں، میں ادارے کے لیے نئے سروس رولز بنا سکی۔ اس کے لیے میں خصوصاً مجھے کے دیگر افسران کی ممنون ہوں۔

لیکن اب یہ نیا الجھاؤ سامنے آیا ہے کہ ماضی کی کسی کوتاہی کے باعث، پروموشن اور نئے عہدے تو برطرف، اس ادارے کے موجودہ عہدوں کے تسلسل کا بھی کوئی قانونی ثبوت موجود نہیں ہے، گویا:

مت کیجیو اعتبارِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اس صورت میں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ پھر اتنے برس اسے بجٹ کیوں کر دیا جاتا رہا اور 'غیر موجود' عہدوں کو تنخواہیں کیسے دی جاتی رہیں؟ لیکن سوال اٹھانے سے حاصل ہی کیا، بہ قول غالب:

پُرسش ورق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل ہے

اس ضمن میں جو دستاویزی ثبوت فنانس کو درکار ہیں اس کے لیے میں نے ادارے کے پچاس سالہ ریکارڈ کی چھان بین کی، جو کچھ مجھے مل سکا وہ حسب ذیل ہے:

الف۔ جناب شان الحق حقی نے ۱۲ نومبر ۱۹۵۹ء میں ادارے کے عہدوں کی تخلیق کے لیے ایک خط ڈپٹی سکریٹری، منسٹری آف فنانس کو لکھا تھا۔ اس خط کا جواب ادارے کے ریکارڈ میں نہیں، شاید فنانس کے ریکارڈ میں ہو؟ لیکن اس کے بعد تمام عہدوں کی تنخواہیں ملنا شروع ہوگئیں۔ گویا آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

ب۔ ادارے کے سلسلے میں جو آخری قرارداد ۱۹۸۶ء میں منظور کی گئی تھی اس کے بعد ادارے کے مختلف عہدوں کے لیے وزارت تعلیم سے ایک نوٹیفکیشن جاری کیا گیا تھا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

Notification No.
F 508/84, LB1,
Dated 17 February 1985

ج۔ ۸ مئی ۱۹۹۰ء میں وزارت تعلیم نے جناب فرمان فتح پوری کو ایک اتھارٹی لیٹر بھیجا تھا کہ وہ اردو ڈکشنری بورڈ میں مناسب عہدے تشکیل دے سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

No. F 3-12/89-LB1

اس سے زیادہ ادارے کے ریکارڈ میں کچھ نہیں ہے۔ اب آپ سے گزارش یہ ہے کہ،

اردو ڈکشنری بورڈ پاکستان کے قدیم ترین اداروں میں سے ہے۔ اس کا وقار، استحکام اور فعالی میری ذاتی جاگیر نہیں۔ آپ سب پاکستان کے قابلِ تعظیم شہری ہیں اور یہ آپ کی اپنی ذمہ داری بھی ہے لہٰذا اب یہ معاملہ میں آپ کی اپنی صواب دید پر چھوڑتی ہوں۔

میرا ناچیز مشورہ یہ ہے کہ ماضی کی کوتاہیوں پر تین حرف بھیجے جائیں۔ ادارے میں موجود عہدوں کے مسلسل تنخواہ دینے کو ان عہدوں کے وجود کا ثبوت تسلیم کر لیا جائے اور اس بنیاد پر ملازمین کی ترقی اور انتظامی نئے عہدوں کی تشکیل پر غور کیا جائے۔ اس طرح ہم سرخ فیتے کے اس جال سے باہر نکل آئیں گے جس کے الجھاؤ میں اس ادارے کا نہ صرف مستقبل نہایت تاریک ہو جاتا ہے بلکہ اس کے وجود ہی پر ایک بڑا سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

بصد احترام و خلوص

فہمیدہ ریاض

(باقی آئندہ)

◆◆◆

اردو دُنیا

اردو اساتذہ ایسے اسکولوں میں تعینات کیے گئے جہاں اردو کے طلبہ ہی نہیں

شاہ جہاں پور (۱۹ر اکتوبر)۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے ضلع جنرل سکریٹری عظیم احمد خاں نے بتایا کہ ضلع میں اردو اساتذہ ایسے اسکولوں میں تعینات کردیے گئے ہیں جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد صفر ہے۔ اس بدنظمی سے اردو کی تعلیم و تربیت میں دشواری پیدا ہورہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ضلع میں درجنوں ایسے اسکول ہیں جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی اچھی خاصی تعداد ہے مگر وہاں اردو اساتذہ کی تقرری نہیں کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس بدانتظامی کو روکنے کے لیے ایسوسی ایشن کے ایک وفد نے بی ایس اے سے ملاقات کی مگر ان کی طرف سے کوئی مثبت پہل نہیں کی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ ایسوسی ایشن کے مطالبے پر محکمۂ بیسک تعلیم کے ذریعے صوبے کے بھی بیسک تعلیم افسران سے ان کے اضلاع کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم حاصل کررہے طلبہ کی تعداد اور اردو اساتذہ کی تقرری ہونے کی اطلاعات مانگی گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ محکمۂ بیسک تعلیم ماضی میں بھی غلط اطلاعات بھیج کر اعلا افسران کو گمراہ کرتا رہا ہے۔ اس عمل سے اردو کی تعلیم پر منفی اثر پڑا ہے۔ انھوں نے ضلع کے اردو اساتذہ سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے اسکول اور قرب و جوار کے اسکولوں میں اردو طلبہ کی حقیقی تعداد اور اساتذہ، حاضری کی صحیح اطلاع محکمے کو مہیا کرائیں اور اس کا ایس ایم ایس ایسوسی ایشن کے موبائل نمبر 9450417038 اور 9936093095 پر بھیج دیں تاکہ ایسوسی ایشن اپنی سطح سے بھی اطلاعات حکومت و محکمہ کو مہیا کراسکے۔

(انقلاب۔ دہلی)

بوکارو میں 70 ہزار اردو آبادی اردو تعلیم سے محروم

بوکارو (۲۱ر اکتوبر)۔ ضلع کے جریڈیہ بلاک حلقے میں اقلیتی مسلم برادری کے تقریباً 35 مواضعات ہیں جن کی آبادی تقریباً 70 ہزار ہے۔ یہ علاقہ ترقی کے معاملے میں تو بدحال ہے ہی، افسوسناک بات یہ ہے کہ یہاں کے بچے اردو تعلیم سے کوسوں دور ہیں۔ بچے اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ضرور رکھتے ہیں مگر یہ خواہش پوری نہیں ہوپاتی کیوں کہ 35 مواضعات کے 70 ہزار اقلیتوں کی آبادی پر صرف ایک اردو پرائمری اسکول ہے جس میں درجہ پانچ تک کی ہی پڑھائی ہوتی ہے۔

یہاں کے عوام کا اکثر یہ مطالبہ رہا ہے کہ مڈل اور ہائی اسکولوں میں اردو میں تعلیم کا انتظام حکومت کرے مگر آج تک ان کے مطالبات تسلیم نہیں کیے گئے۔ اسلام پور، کوٹہ ٹانڈ، آرزو، بیلا ٹیپ، بہادر پور، ناگوبالی ڈیپ، جھنا موڑ، باندھ ڈیہ وغیرہ مسلم گاؤں ہیں، ان سبھی گاؤں کے لیے صرف ایک پرائمری اردو اسکول ہے، جہاں ایک ٹیچر اور دو پارا ٹیچر مامور ہیں جب کہ بچے اور بچیوں کی تعداد 306 ہے۔

اسکول کا قیام ۱۹۲۹ میں ہوا تھا۔ اسکول میں اس وقت صرف چار کمرے ہیں۔ یوں تو اردو جھارکھنڈ کی دوسری سرکاری زبان ہے مگر عملی طور پر ضلع میں نظر نہیں آتی۔ پورے بوکارو میں اردو ٹیچر کی کمی ہے۔ ضلع کے صرف دو فیصد ہی اسکولوں میں اردو اساتذہ ہیں۔ ضلع کے ڈی ای آفس یا ڈی سی آفس میں افسران کی تختیاں اردو میں نہیں ہوتی ہیں، اردو میں درخواستیں بھی نہیں لی جاتیں۔ بوکارو کے مسلم حلقے پہلے سے ہی ایم پی اور ایم ایل اے فنڈ سے محروم رہے ہیں۔ انجمن حسین رضا کے صدر جہانگیر حسین نے بتایا کہ گاؤں میں مولانا عربی و اردو کی تعلیم دیتے ہیں، کئی مرتبہ عوامی نمائندے، ایم ایل اے، ایم پی سے کہا گیا مگر وہ توجہ نہیں دیتے۔ ضلع کانگریس کے جنرل سکریٹری شکیل احمد انصاری صاحب نے کہا کہ جھارکھنڈ کی تشکیل کے بعد سے جو حکومتیں بنیں انھوں نے کبھی اردو کی طرف توجہ نہیں دی۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو اساتذہ کی تقرری ضابطوں کے تحت کرانے کی یقین دہانی

لکھنؤ (۱۸ر اکتوبر)۔ اردو اساتذہ کے امیدواروں کے لیے ادیب کی سند کو بھی حسبِ سابق ہائی اسکول کے مساوی تسلیم کیے جانے کے سلسلے میں معلم اردو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ایک وفد نے جمعرات کو وزیر اعلا سے ان کی سرکاری رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ مگر پنچایت قنوج کے سابق چیئرمین حاجی محمد حسن صدیقی کی قیادت میں چار رکنی وفد نے وزیر اعلا کو اردو اساتذہ کی تقرری میں اپنائے جانے والے ضابطوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سال ۱۹۹۴ء میں ان کے والد اور سابق وزیر اعلا ملائم سنگھ یادو کی قیادت والی حکومت میں اپنائے گئے ضابطوں سے واقف کرایا۔ وفد نے وزیر اعلا کو بتایا کہ اردو اساتذہ کی تقرری بہ طور زبان کے استاد کے ہوتی ہے، اسی کے پیش نظر ۱۹۹۴ء میں بھی ادیب کی سند کو ہائی اسکول کے مساوی تسلیم کیا گیا تھا اور اسی بنیاد پر تقرری ہوئی تھی۔ وفد نے اس سے متعلق تمام دستاویزات، سرکاری حکم نامہ، تقرری کا اشتہار، تقرری نامہ و دیگر تفصیلات کی پوری فائل بھی وزیر اعلا کو سونپی۔ وزیر اعلا نے وفد کو یقین دہانی کرائی کہ جس طرح ۱۹۹۴ء میں اردو اساتذہ کی تقرری کا طریقہ اپنایا گیا تھا اس کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ تعلیمی لیاقت و صلاحیت کے ساتھ ضابطوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مرتبہ بھی اردو اساتذہ کی تقرری کرائی جائے گی۔ انھوں نے یقین دلایا کہ جلد ہی اردو اساتذہ کی تقرری میں درپیش مسائل کا خاتمہ کراتے ہوئے جلد از جلد ان کی تقرری کی راہ ہموار کی جائے گی۔ وفد میں ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری ایم آئی ناظم، حافظ محمد عارف اور وائل یادو شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

بی ایم سی مکتب کا نام بدل کر راجکیہ اپ گریڈ اردو مڈل اسکول کردیا گیا لیکن اردو اساتذہ کی تقرری نہیں کی گئی

دربھنگہ (۱۳ر اکتوبر)۔ ہندستان میں اردو کے نام پر اردو والوں کو عجیب عجیب بہلاوے دیے جاتے رہے ہیں۔ ایسا ہی کچھ ہوا ہے تارڈیہ بلاک کے اہجرہ پنچایت میں کہ یہاں کے بی ایم سی مکتب کا نام بدل کر راجکیہ اپ گریڈ اردو مڈل اسکول کا نام تو دے دیا گیا لیکن نام کے علاوہ اس میں اردو میں کام کاج کی سطح پر کچھ بھی نہیں ہوسکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی درجے میں اردو میں تدریس تو کجا اردو کی کتابیں بھی فراہم نہیں کی جاتی ہیں۔ اردو اسکول ہونے کی وجہ سے یہاں زیادہ تعداد اردو داں بچوں کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر اساتذہ غیر اردو داں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اساتذہ اردو جاننے والے نہیں ہوں گے تو بچوں کو اردو میڈیم سے کیسے پڑھائیں گے۔ اس لیے سارے مضامین ہندی میڈیم میں ہی پڑھائے جاتے ہیں جب کہ اردو داں طبقہ اپنے بچوں کے لیے اس اسکول کو اردو میڈیم سے پڑھنے کے لیے ترجیح دیتا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ گاؤں کے باشندے وزیر تعلیم پی کے شاہی، ایم ایل اے عبدالباری صدیقی، چیف سکریٹری اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ، ضلع کلکٹر دربھنگہ، ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر دربھنگہ اور بلاک ایجوکیشن افسر سے مل کر مطالبہ کرچکے ہیں کہ اردو اسکول کا نام دینے کے بعد اسے ہندی کے طور پر کیوں استعمال کیا جارہا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

تمنا تماپوری کی وفات پر تعزیتی جلسہ

رانی بنور (پریس ریلیز)۔ ریاست کرناٹک کے مشہور و معروف شاعر تمنا تماپوری ۲ر اکتوبر ۲۰۱۳ کو اچانک رحلت فرماگئے۔ بزم اردو رانی بنور کے زیر اہتمام بزم کے صدر ایم اے علی کی صدارت میں ۳ر اکتوبر کو ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ جلسے میں بزم کے سکریٹری ظہیر رانی بنوری نے تمنا تماپوری کی (78 سال کی عمر میں) اچانک رحلت پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم ریاست کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ وہ ریاست کے تمام جرائد اور رسائل میں اور بیرونِ ریاست کے بھی مشہور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کرناٹک اردو اکیڈمی نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ایوارڈ سے بھی نوازا۔ مجھے دو مشاعروں میں ان کے ساتھ کلام پڑھنے، مل بیٹھنے اور بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ نہایت پُرخلوص اور ملنسار شخص تھے۔ ان کے دو مجموعۂ کلام ’چھلکی چھلکی ساتیاں‘ اور ’سویرے سے پہلے‘ منظر عام پر آئے اور انھیں پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔ جلسے میں مرحوم کی مغفرت اور پس ماندگان کے صبرو استقلال کے لیے دعا کی گئی۔

جلسے میں نواب ملا، اصغر علی، غوث محی الدین، نور احمد، ایس ایم پاٹل، نذیر احمد اور عبدالعزیز وغیرہ شریک تھے۔

گاندھی گھاٹ پر سائن بورڈ اردو میں بھی نصب کیا جائے

کلکتہ (۱۷ر اکتوبر)۔ گنگا ندی کے کنارے گاندھی گھاٹ کے صدر دروازے پر باقاعدہ تین سائن بورڈ تین زبانوں ہندی، بنگلہ اور اردو میں لگے ہوئے تھے۔ اس بورڈ میں گاندھی گھاٹ کے اندر داخلے کے قوانین و ضوابط لکھے گئے ہیں تاکہ کوئی اس کے اندر غیر قانونی حرکت یا فعل نہ کرے۔ گاندھی جینتی کے پہلے ان تینوں سائن بورڈوں کو رنگ و روغن کے ساتھ نئے سرے سے ہندی اور بنگلہ کے بورڈ لکھ کر مکمل کردیے گئے، مگر اب تک اردو کے بورڈ نہیں لکھے گئے ہیں۔ اردو کا بورڈ اب تک خالی پڑا ہوا ہے جب کہ گزشتہ ۲ر اکتوبر کو گاندھی جینتی کے موقعے پر گورنر موصوف کے نرائن صبح ۹ بجے گاندھی گھاٹ پر تشریف لائے اور بابائے قوم گاندھی جی کو گلہائے عقیدت پیش کرکے چلے بھی گئے۔ کیا گورنر صاحب کی نظریں ان بورڈوں پر نہیں پڑی ہوں گی۔ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے سکریٹری محمد علی جان نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی بھی تعصب کے شکار ہوگئے ہیں۔ ان کے نام سے منسوب سائن بورڈ پر اردو میں ہیڈ لائن صرف لفظ (اپیل) لکھ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں سکریٹری موصوف نے گاندھی گھاٹ کے کیئر ٹیکر، پولیس ہیڈ کوارٹر کے اعلا عہدیدار، بارکپور ایس ڈی او، بارکپور میونسپلٹی کے چیئرمین اتم داس، ایم ایل اے سیل بھدرا دت، ایم پی دنیش ترویدی سے اپیل کی ہے کہ اردو سائن بورڈ فوراً لکھوائے جائیں تاکہ اردو عوام میں جو غلط فہمی پائی جارہی ہے وہ دور ہوجائے۔ ایسا نہ ہو کہ اردو بورڈ اسی طرح خالی پڑا رہے اور پھر اس کے بعد وہاں سے غائب ہوجائے، چوں کہ برسوں سے

عربی فارسی و پالی زبانوں کو سول سروسز امتحانات سے نکالنا ایک سازش

الٰہ آباد (۱۳؍اکتوبر)۔ اقبال اکیڈمی کی جانب سے یو پی ایس سی سے عربی، فارسی و پالی زبانوں کو نکالے جانے کے خلاف ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کا ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت اقبال اکیڈمی کے صدر اور اترپردیش کے سابق ایڈووکیٹ جنرل سید محمد احمد کاظمی نے کی۔ نظامت کے فرائض اردو کے ممتاز ناقد و دانش ور پروفیسر علی احمد فاطمی نے انجام دیے۔ جلسے کی ابتدا میں آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے جنرل سکریٹری سید حسنین اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عربی فارسی زبانوں کو مقابلہ جاتی امتحانات سے نکالنا فرقہ پرست طاقتوں کی سازش کا حصہ لگتا ہے اور کانگریس کے دور اقتدار میں اس طرح کا فیصلہ ہم سب کے لیے چونکانے والا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر جعفری نے کہا کہ عربی فارسی زبانیں غیر ملکی نہیں رہی ہیں بلکہ ہندوستان کے خمیر میں اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ ہندوستان کی مقامی زبانوں کی طرح ہی ہیں۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے سینئر وکیل ایم اے قدیر نے کہا کہ یہ زبانیں ہمارے ملک کی کلاسیکی زبانیں ہیں اور عربی زبان کے ساتھ خاص بات یہ ہے کہ دنیا کے تقریباً پچیس ملکوں میں بولی جاتی ہے اس لیے بھی یہ زبان ہمارے ملک اور عرب دنیا کے درمیان ایک رابطے کا کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر صالحہ رشید نے اس تحریک کو اور زیادہ طاقتور بنانے پر زور دیا اور کہا کہ یہ تحریک اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک کہ حکومت اپنے فیصلے کی تنسیخ نہ کرلے۔ ہندی کے ادیب سریندر راہی نے کہا کہ عربی، فارسی اور پالی زبانوں کو نکالنا ایک بڑی سازش کا حصہ ہے۔ صدر جلسہ کاظمی صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ عربی و فارسی زبانوں نے ہماری گنگا جمنی تہذیب کو بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، ان زبانوں کو ہم ہندوستان کی تہذیب و تاریخ سے جدا نہیں کرسکتے۔ علاوہ ازیں عربی فارسی زبانوں کو مقابلہ جاتی امتحانات سے الگ رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کانگریس حکومت اقلیتی طبقے کے نوجوانوں کو ان ملازمتوں سے محروم کرنا چاہتی ہے اس لیے حکومتِ وقت کو چاہیے کہ وہ فوراً اس فیصلے کو واپس لے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو مترجم دوسری زبان میں کام کرنے پر مجبور

اردو داں طبقہ تھانوں اور دیگر دفاتر میں اردو میں درخواست ہی نہیں دیتا

جونپور (۱۵؍اکتوبر)۔ اردو مترجم دوسری زبان میں کام کرنے پر مجبور ہیں کیوں کہ اردو داں طبقہ تھانوں اور دیگر دفاتر میں درخواست ہی نہیں دیتا۔ اردو زبان کی ترقی اور فلاح کے لیے تمام طرح سے آوازیں اٹھائی جارہی ہیں، کہیں اردو کو روزی سے جوڑنے کے نام پر تو کہیں زبان کے نام پر جوڑنے کی وکالت کی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے لوگ لاٹھیاں بھی کھا چکے ہیں بلکہ چند دن پہلے اردو کے چند اساتذہ پانی کی ٹنکی پر چڑھ کر اپنا احتجاج درج کروا چکے ہیں، لیکن اردو کے لیے ہم کتنا بیدار ہیں یہ اپنے آپ میں بہت بڑا سوال ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی وزارت ریل جو عام آدمی کو سہولت عطا کرتی ہے، جس سے ہزاروں لوگ سفر کرتے ہیں اور حکومت کو لاکھوں روپیوں کا فائدہ بھی ہوتا ہے اس کا اقلیتی اردو کے ساتھ خود بخود دیکھا جاتا ہے کیوں کہ اکثر بڑے شہروں کو چھوڑ کر اس کے بورڈ پر اردو کی تحریر اس انداز میں ہوتی ہے کہ اس کو پڑھ کر سمجھ مشکل ہوتا ہے کہ آخر کیا لکھا گیا ہے۔ وہیں ہندی و انگریزی کے ساتھ دیگر زبانوں کی تحریر خوش کن ہوتی ہے۔ اس ضمن میں نمائندہ نے اسٹیشن پر لگے سائن بورڈ کی تحریر کے بارے میں ایک افسر سے رابطہ کیا تو اس نے نام نہ شائع کرنے کی شرط پر بتایا کہ یہ کام تو معائنہ کرنے والے افسر کا ہوتا ہے، انھی کے ذریعے کتابت کروائی جاتی ہے۔ افسران تو اردو سے واقف نہیں ہوتے ہیں، جس انداز سے انھیں تحریر کیا ہوا ملتا ہے اسی کو نقل کردیا جاتا ہے۔ اب تحریر صحیح ہو یا غلط، ان کا تو کام صرف لکھنا ہے۔ وہیں دوسری جانب سماجوادی پارٹی نے اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے ساتھ اردو کے فروغ کے لیے تھانوں و تحصیلوں میں اردو مترجم کی تعیناتی کی ہے۔ ضلع کے تقریباً 27 تھانوں میں اردو کے مترجم تعینات ہیں لیکن جب نامہ نگار نے تھانوں میں اردو تحریر دینے کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ تھانوں میں آنے والی اردو کی تحریر نہ کے برابر ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس اردو کے لیے ہم لاٹھی ڈنڈا تک کھانے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن جب افسران کو اردو میں تحریر دینا ہوتا ہے تو ہم گریز کرتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ اردو کے نام پر رکھے گئے یہ ملازم کام نہیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ کام بھی کرتے ہیں اور تنخواہ بھی لیتے ہیں، لیکن اردو کے ترجمے کا کام نہ ہونے کی وجہ سے انھیں دوسرے کاموں سے منسلک کردیا جاتا ہے۔ اردو والوں کی یہ حالت ہے کہ آج بھی ہمیں کوئی درخواست تھانوں وغیرہ میں دینی ہوتی ہے تو سب سے پہلے ہم کسی ہندی لکھنے والے کی تلاش کرتے ہیں اور اس سے ہندی میں درخواست لکھنے کی سفارش کرتے ہیں، جب کہ ہماری یہ ذمہ داری تھی کہ ہم اردو میں درخواست لکھ کر دیتے اور وہاں پر اردو کام کرنے والے تعینات ملازم اس کا اردو میں ترجمہ کرتے، جس سے ان کو سکون ملتا کہ چلو اردو سے متعلق ہم سے کچھ کام تو لیا جارہا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

گاندھی گھاٹ کے بورڈ پر اردو رسم الخط کے 'اپیل' میں اس کے قوانین و ضوابط کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ دور دراز سے لوگ گاندھی گھاٹ کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ بورڈ میں کیا لکھا ہے پڑھ کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ حکومت یا اس کے محکمے اردو سائن بورڈ نہیں لکھ پارہے ہیں تو انجمن یا اردو عوام کو لکھنے کی اجازت دی جائے، اردو والے لکھ دیں گے یا لکھوا دیں گے۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

اردو ٹیچنگ سنٹر کا افتتاح

جودھپور (۳؍اکتوبر، پریس ریلیز) زبانیں مذہبوں کی نہیں تہذیبوں کی دین ہوتی ہیں اور اردو قومی سطح پر مشترکہ زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے بزم اردو، جودھپور اور سروکار کے زیر اہتمام مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش کے موقعے پر راجستھان اردو اکادمی، جے پور کے مالی تعاون سے منعقد 'اردو ٹیچنگ سنٹر' کے افتتاح کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے دروازے تمام زبانوں کے لیے کھلے ہیں اور یہ ایسا دریا ہے جس میں مختلف دریائیں جڑی ہوئی ہیں۔ مہمان خصوصی راجستھان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس مکھراج کالا نے سینٹر کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہندستانی زبان ہے اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کی مثال اور نشانی ہے جو ہمیں جینے کا ہنر سکھاتی ہے۔ راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے ڈی راہی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو سیکھنا نہایت آسان ہے اور اس سینٹر کے ذریعے لوگوں کو اردو زبان سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ریٹائرڈ آئی پی ایس مراد علی ابڑا نے اظہار خیال کرتے ہوئے لوگوں کو سینٹر کے ذریعے جڑنے کا پیغام دیا۔

پروگرام کے آغاز میں بزم اردو جودھپور کے سکریٹری ڈاکٹر نثار راہی نے استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے بزم اور راجستھان اردو اکادمی، جے پور کے ذریعے ہونے والے پروگراموں پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی اجلاس میں ہندی، اردو اور راجستھانی زبانوں کے ادیب اور معزز افراد موجود تھے۔ نظامت کے فرائض محمد افضل جودھپوری نے انجام دیے اور شکریہ سروکار کے برجیش تجرے نے ادا کیا۔

اردو اسکولوں کے ساتھ حکومت کا سوتیلا رویہ

دربھنگہ (۱۶؍اکتوبر)۔ حکومت مسلمانوں کو یہ یقین دہانی کراتی رہی ہے کہ جہاں بھی دس مسلمان بچے ہوں گے وہاں اردو استاذ بحال کیا جائے گا۔ اس پر صد فیصد کیا ۸۰ فیصد بھی عمل نہیں ہو پارہا ہے۔ وہیں جو اساتذہ اردو کے لیے بحال ہیں ان سے بیشتر جگہوں پر اردو تدریس کے کام نہیں لیے جارہے ہیں۔ آج بھی ریاست بھر میں ایسے سیکڑوں اسکول ہیں جو اردو اسکول کے نام سے جانے جاتے ہیں لیکن یہ نام محض اس لیے ہیں کہ وہ مسلمان علاقوں میں قائم ہیں ورنہ ان اسکولوں میں اردو کی زیادہ سے زیادہ تعلیم محض ایک مضمون کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ حالاں کہ اردو اسکول کہلانے کے مستحق وہ اسکول ہیں جہاں سارے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہوں، لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس معاملے میں اردو والوں کا رویہ بھی کم مایوس کن نہیں ہے۔

ایک توجہ طلب امر یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں سروشکشا ابھیان کے تحت طلبہ و طالبات کو مفت کتابیں فراہم کرائی جاتی ہیں، لیکن اردو اسکولوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ ان اسکولوں میں اردو مضمون کے علاوہ ریاضی، سائنس اور سماجی مطالعے کی کتابیں اردو میں فراہم نہیں ہو پاتی ہیں جس کی وجہ سے مجبوراً اردو کے نام سے وابستہ اسکولوں کے طلبہ و طالبات کو ہندی کے ذریعے سارے مضامین پڑھنے پڑتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اردو کے نام سے وابستہ اسکولوں میں سارے اساتذہ بھی اردو داں نہیں ہوتے ہیں۔ جب اساتذہ اردو نہیں جانیں گے تو وہ اردو میں بچوں کو کیا تعلیم دے سکیں گے۔ قابل ذکر یہ ہے کہ اس نئے سیشن میں دربھنگہ ضلع میں طلبہ کو سارے مضامین تو کیا اردو مضمون کی کتابیں بھی فراہم نہیں کرائی گئی ہیں۔ ذرائع سے ملی اطلاع کے مطابق ابھی تک یہ شائع بھی نہیں ہوئی ہیں، جب کہ سرکاری اسکولوں میں جو کتابیں شامل نصاب ہیں وہ حکومت کی اپنی تیار کردہ ہیں اور بازار میں بکتی بھی نہیں ہیں۔ ایسے میں طلبہ کا اپنی مادری زبان کی تعلیم سے محروم رہ جانا مقدر ہوگا۔ اس صورت حال میں خود اردو والوں کو اردو کے نام پر ووٹ کی سیاست کرنے والی حکومتوں سے پوچھنا ہوگا کہ وہ آخر ان کے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک توجہ طلب امر یہ بھی ہے کہ سہل اور موثر تدریس کے لیے اساتذہ کو بلاک سطح پر مختصر مدتی تربیت دی جاتی ہے، لیکن اس میں اردو کو نظر انداز کردیا جاتا ہے اور اس کی تربیت نہیں ہو پاتی ہے۔ اس سوتیلے پن کے خلاف خود اردو اساتذہ کو کھڑا ہونا ہوگا اور حکومت سے مطالبہ کرنا ہوگا کہ دوسرے مضامین کی طرح اس مضمون کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض جگہوں پر اساتذہ نے مطالبہ بھی کیا ہوگا لیکن تلخ بات یہ ہے کہ مطالبے میں جو مضبوطی ہونی چاہیے وہ نہیں رہتی ہے اور پھر اردو اساتذہ میں جو اتحاد ہونا چاہیے وہ بھی نہیں ہوتا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

نئی کتابیں

نام کتاب : **مخمور سعیدی**
ہمہ جہت فن کار
مرتبین : پریم گوپال متل، مدثر علی خاں
ضخامت : ۴۰۰ صفحات
قیمت : ۴۵۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی-۲
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی
razakidak@gmail.com

اردو زبان وادب میں اُدبا وشعرا کے حوالے سے آئے دن نئی نئی کتب منظر عام پر آتی رہتی ہیں جن میں عقیدت مندی کا کچھ ایسا سیلاب امڈتا ہے کہ فن اور شخصیت میں اعتدال قائم نہیں رہتا اور بات تصنع وتکلف سے بھی آگے بڑھ کر غلو کی منزل میں پہنچ جاتی ہے لیکن باوجود اس کے کچھ ایسی نگارشات بھی منظر عام پر آتی ہیں جو بلاشبہ قابل ستائش ہوتی ہیں، ایسی ہی کتابوں کے زمرے میں پریم گوپال متل کی تازہ ترین کتاب 'مخمور سعیدی: ہمہ جہت فن کار' کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب مخمور سعیدی کے فن اور شخصیت کے حوالے سے مرتب کی گئی ہے جس میں سوانحی کوائف اور پیش لفظ کے علاوہ عصر حاضر کے مشاہیر ادب کے اٹھارہ مضامین شامل ہیں جو نہ صرف تاثراتی ہیں بلکہ تحقیقی اور تنقیدی بھی ہیں جن میں مخمور سعیدی کی شخصیت کے زیادہ تر پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مخمور سعیدی کی شخصیت میں شاعری کا التزام زیادہ تھا۔ مخمور سعیدی نے اردو غزل کی عظیم الشان روایات سے عصری تجربات ومحسوسات کو بیشتر اوقات خوب صورت ہنرمندی سے فنی سطح پر ہم آہنگ کیا ہے۔ مخمور سعیدی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو عروض پر دسترس رکھتے ہیں۔ مخمور سعیدی کے حوالے سے ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اپنے مضمون 'مخمور سعیدی کا ذہنی پس منظر' میں یوں رقم طراز ہیں:

"مخمور سعیدی کے ذہنی سفر کی نئی منزلوں کی نشان دہی کرتے ہوئے یہاں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ خواص کے نزدیک ادبی حیثیت مسلّم ہونا ایک بات ہے اور عوامی مقبولیت حاصل ہونا دیگر۔ ہمارے بہت سے ایسے اساتذہ ہیں جن کے نام ادب کی تاریخ میں محفوظ ہیں مگر عوام ان سے واقف نہیں۔ مخمور سعیدی کی ادبی حیثیت کو جہاں اہل علم نے تسلیم کیا ہے وہیں وہ ان لوگوں کے بھی مقبول شاعر ہیں جنھیں عوام الناس کہا جاتا ہے"۔

مخمور سعیدی نے اپنے فن پاروں میں عصری تقاضوں کو پورا کرنے میں مخلص رویہ اپنایا جس کا ذکر اس کتاب میں شعرا وادبا نے اپنے اپنے طور پر کیا ہے۔ مخمور صاحب کی شعری اور نثری خدمات کی ایک طویل فہرست ہے جس کی اشاعت کے بعد چند اہم تبصرے بھی لکھے گئے، ان میں سے 'گفتنی' پر نیاز فتح پوری، 'آواز کا جسم' پر ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی اور 'سب رنگ عہد کی صدائیں' پر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کے تبصرے کو بھی اس میں خصوصی طور پر شامل کیا گیا ہے۔ مخمور سعیدی کی ادبی شخصیت میں بہ حیثیت مدیر انھوں نے کئی اہم رسالوں کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نثر میں بھی جو کچھ لکھا ان میں سے چند منتخب نثری تخلیقات کو بھی شامل کیا گیا ہے جس میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، بسمل سعیدی، گوپال متل، ساحر لدھیانوی اور شین کاف نظام پر لکھے گئے ان کے مضامین شامل کتاب ہیں۔ آخر میں قاری کی دل چسپی کا خیال رکھتے ہوئے مخمور سعیدی کی کچھ منتخب منظوم تخلیقات کے تحت نظمیں اور غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں جن کو پڑھ کر قاری مخمور سعیدی کے فن سے بھی روبرو ہوسکتا ہے۔ کتاب اپنے عنوان کے عین مطابق ہے جس میں مخمور سعیدی کی ہمہ جہت شخصیات کا احاطہ کرنے میں مرتبین کامیاب نظر آتے ہیں۔ امید کہ ادبی حلقوں میں اس کاوش کو سراہا جائے گا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

☆☆☆

نام کتاب : **ڈاکٹر محمد حسن**
آڑے ترچھے آئینے
مرتب : عبدالسمیع
قیمت : ۳۰۰ روپے
ملنے کا پتہ : تخلیق کار پبلشرز
205/6، بے ایکسٹینشن،
لکشمی نگر، دہلی-110092
تبصرہ نگار : جاوید رحمانی
rahmanijnu@gmail.com

مغلوں کے سیاسی زوال پر نہایت دل چسپ تبصرہ خلیق احمد نظامی نے یوں کیا تھا کہ "جس جمنا کے کنارے کبھی ہاتھیوں کی لڑائیاں دیکھی جاتی تھیں وہاں اب مغل بھائی بٹیروں کی لڑائیاں اور پتنگوں کے معرکے دیکھتے تھے"۔ یہ زوال جب عوامی زندگی پر بھی آیا تو مغل بھائی کا یہ ذوق عوام الناس میں بھی منتقل ہوگیا چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں پہلے رؤسا اور پھر عام آدمی بھی اس ذوق قبیحہ میں اس حد تک گرفتار ہوا کہ چوک چوراہوں پر بھی بٹیر بازی اور پتنگوں کے معرکے میں منہمک ہجوم نظر آنے لگا۔ یہ ہمہ جہتی زوال ایسا تھا کہ اس سے ہمارے ثقافتی اور علمی ادارے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ چناں چہ یہی بٹیر اور پتنگ آرائی کی مختلف قسمیں ان اداروں میں بھی نظر آنے لگیں اور اس کو مہمیز دینے کا کام کیا ہمارے علمی زوال نے جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہر کس و ناکس ان میں سے بہت سے اداروں کی زمام صدارت سنبھالے بیٹھا تھا اور جس کے نام پر قرعہ نہیں نکلا وہ کسی نہ کسی پرچے کا مدیر بن بیٹھا۔ اس طرح ان بے دحضرات نے، جو علمی ذوق سے معریٰ اور فکر ونظر کی دولت سے محروم محض تھے، بٹیروں اور پتنگوں کی جگہ اپنے جیسے نوجوان گدھوں کو تھپکی اور ان کی سرپرستی کرکے نئے زمانے کے نئے بٹیروں کو لڑانے میں مصروف ہوگئے، اور بٹیر بازی کو یہ پیشہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکے اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان بٹیروں کو شہرت بھی دی جائے، اس کار خیر کو انجام دینے کے لیے نسخہ یہ تجویز کیا گیا کہ نئے بٹیر اپنے بارے میں فرضی مراسلے تقسیم کروائیں، ادھر کی باتیں ادھر کریں، اپنے نام سے انٹرنیٹ پر طرح طرح کے بلاگ بنائیں، اپنے جیسے دوسرے بٹیروں میں سے بعض کی ملی بے مائیگی سے فائدہ اٹھا کر ان کے پرچوں میں اپنی ذات گرامی پر گوشے چھپوائیں اور اپنے جیسے معصوموں کی انجمن بنا کر نئے نئے پرچوں کا اجرا کروائیں اور ان کے سرورق پر اپنی تصویریں چھپوا کر ہمارے ادبی وتہذیبی زوال کے تقریباً مکمل ہوجانے کا نوحہ سنائیں۔ غرض یہ کہ چہل پہل تو ہو مگر یہ چہل پہل نوحہ، غم ہو نوحہ شادی نہ ہو۔ اردو کے موجودہ ادبی منظرنامے پر یہ صورتیں اس حد تک نمایاں ہیں کہ نئی نسل میں جو ایک آدھ سنجیدہ لوگ ہیں بھی ان کی طرف یا تو نظر نہیں جاتی یا جاتی ہے تو پہلا گمان ان پر بھی یہ گزرتا ہے کہ وہ بھی کہیں اسی ابتذال کا حصہ نہ ہوں۔

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے 'ڈاکٹر محمد حسن آڑے ترچھے آئینے' کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ 'ہمارے تمام اہم رسالوں کے مدیر علمی اور ادبی دنیا میں اپنی منفرد حیثیت رکھتے تھے اور ان کی شخصیت کا نقش بھی مضامین کے انتخاب، موضوعات اور ترتیب پر ہوتا تھا' اور یہ درست ہے مگر اب صورت حال تبدیل ہوچکی ہے اور بکثرت تبدیل ہوچکی ہے۔ اب ہمارے رسائل کے بیش تر مدیران وہ حضرات ہیں جو ادبی تربیت سے محروم ہیں اور ان کے 'فرمودات عالیہ' کا متحمل کوئی اچھا رسالہ نہیں ہوسکتا چناں چہ انھوں نے کسی رسالے کا اجرا کرکے اپنی تشہیر اور اپنے جیسوں کی تطہیر کا سامان مہیا کرلیا اور راتوں رات 'نامور ادیب اور دانش ور' بن گئے۔ نتیجتاً ان ناخواندہ حضرات کی بن آئی جو جانتے ہیں کہ 'کتنا جھک کر کے سلام کریں'۔ لیکن پہلے ایسا نہیں تھا اور اردو رسالوں کے مدیر نیاز فتح پوری ہوتے تھے، شاہد احمد دہلوی ہوتے تھے، جوش ملیح آبادی ہوتے تھے، میراجی ہوتے تھے، صلاح الدین احمد ہوتے تھے، آل احمد سرور ہوتے تھے، کلیم الدین احمد ہوتے تھے، قاضی عبدالودود ہوتے تھے اور محمد حسن ہوتے تھے۔ اور اسی لیے وہ رسالے رجحان ساز ہوتے تھے جو ادب وہاں سے اٹھتا تھا وہ سارے جہاں پہ برستا تھا۔ پروفیسر محمد حسن کا رسالہ 'عصری ادب' اردو کا ایک ایسا رسالہ تھا جس پر محمد حسن کی شخصیت اور ادبی مزاج کی گہری چھاپ صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس رسالے کا ایک اہم اور تقریباً مسلسل کالم 'آڑے ترچھے آئینے' تھا، جس میں اکثر وبیشتر محمد حسن اور کبھی کبھی کچھ دوسرے ادیب بھی ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل پر تبصرے کرتے تھے۔ اس کالم کے تحت پروفیسر محمد حسن نے ان موضوعات ومسائل پر جو کچھ لکھا تھا ان کو عبدالسمیع صاحب نے 'محمد حسن آڑے ترچھے آئینے' کے نام سے یکجا کرکے شائع کردیا ہے۔ عبدالسمیع نوجوان ہیں اور ادب اور ادبی تاریخ وتہذیب سے گہری دل چسپی رکھتے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت ایک تو اس موضوع کا انتخاب ہی ہے، دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے دیویندر ستیارتھی کی تمام کہانیوں کو دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ دونوں موضوعات ایسے ہیں جن تک ان کی عمر کے ان نوجوانوں کی نظر نہیں پہنچ سکی جن کی آنکھیں عہد حاضر میں میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ کے ایکسپوژر سے اس حد تک خیرہ ہوگئی ہیں کہ وہ پڑھنے اور غور کرنے جیسے 'فرسودہ اور روایتی کاموں' میں وقت برباد کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ ان کی جگہ خوشامدانہ راہ ورسم کو اپنی کل کائنات سمجھتے ہیں اور اس سے جو وقت بچتا ہے اس کا استعمال اپنے اوپر رسالوں کے گوشے نکلوانے اور ریڈیو پر اپنی عالمانہ تصانیف پر بزرگوں سے تبصرے کروانے جیسے منفعت بخش کاموں میں کرتے ہیں، کیوں کہ وہ نوجوان وہ ہیں جن کے جدامجد وہ لوگ تھے جن پر محمد حسن نے 'خوشامدانہ ادب کا عروج' اور 'خوشامدی ادب - کیوں اور کیسے' کے عنوان سے متواتر دو کالم لکھے تھے۔ محمد حسن کے یہ دونوں کالم ۱۹۹۲ میں لکھے گئے ہیں جس میں وہ لکھتے ہیں:

"کمال تو یہ ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر اس منزل تک جا پہنچے کہ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے اور لگے آواز لگانے کہ کوئی خوشامد کرالو، کوئی بھکتی کرالو، اس راستے میں آگئے بہت سے پڑاؤ اور ادوار کا میاں تھیں حکومتوں کے انعام واکرام، راجیہ سبھا کی رکنیت، باہر کے سفر اور دورے، عہدے، تقرریات، گرانٹ، مفت کے مکانات، دھیرے دھیرے غیرت فن بھکتی گئی اور خوشامدانہ ہجو عروج پا تا گیا"۔

اور اس عروج کا اور ان کے جانشین خوشامدیوں کے استغراق کا یہ عالم ہے کہ صرف تیس برسوں میں اب وہ آواز لگانے کے لیے صبح تک کا انتظار نہیں کرتے! اس کالم کا اختتام پروفیسر محمد حسن نے کچھ اس طرح کیا تھا:

"کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے ادیب ہی نہیں (کہ وہ ملک کی تہذیبی امانت اور اس کے صورت گر ہوتے ہیں) ہمارا ادب بھی عرصۂ زیست پر نظر ڈالے تو میر کی طرح مرحوم کے لفظوں میں یہ شکوہ کرنے پر مجبور ہوجائے کہ عہد جوانی گدھوں کو سلام کرنے اور کتوں کا ادب واحترام کرنے میں گزر گیا:

شرم آتی ہے بڑا کہ در جوانی
سگاں ادب نمودن بخراں سلام کردن"

اس میں شک نہیں کہ ان سطروں سے جس دردمندی کا اظہار ہوتا ہے وہ محمد حسن کے ایک حساس اور وضع دار ادیب ہونے پر دلالت کرتی ہے مگر یہ دردمندی ہمارے لیے اور اس زبان کے لیے بھی، جس کے محمد حسن ادیب اور استاد تھے، زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتی تھی اگر یہ دردمندی محمد حسن صاحب کے اعمال وافعال سے بھی ظاہر ہوتی۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے بھی اپنی کل زندگی میں ایسے کچھ لوگوں کی سرپرستی فرمائی جس کا خمیازہ اس زبان کو بھگتنا پڑا اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو بھی۔ اس سرپرستی کی سامنے کی مثالیں نصیر احمد خاں اور محمد شاہد حسین کی شکل میں موجود ہیں جن کا شمار محمد حسن کی باقیات میں کرتے ہوئے

کلیم سرکو آتا ہے:

'زبان، تہذیب اور تراجم' کے عنوان سے جو کالم انھوں نے ۱۹۷۰ء میں لکھا تھا اس میں رومیلا تھاپر، ہربنس مکھیا اور بپن چندرا کی کتاب 'ہندوستانی تاریخ نویسی میں فرقہ واریت' پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے جس کے تقریباً ڈیڑھ صفحے میں نقل کر دینا چاہتا تھا، کیوں کہ وہ سطریں خود ہی محمد حسن کی تاریخ پر گہری نظر کا ثبوت فراہم کر دیتیں۔ مگر میرے اس تبصرے کے لیے جو حدود مقرر کی گئی تھیں میں پہلے ہی ان سے تجاوز کر چکا ہوں، اس لیے یہ ممکن نہیں۔ اس کتاب میں موجود بیشتر کالم بہت عمدہ ہیں اگرچہ کچھ کا اختصار کھٹکتا ہے مثلاً کلیم الدین احمد کی خود نوشت والا کالم۔ ان کالموں سے پروفیسر محمد حسن کی ادبی و تہذیبی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے اور ان میں سے بیشتر کالم ایسے ہیں جن کا مطالعہ زبان و ادب کے ہر سنجیدہ طالب علم کو ایک بار نہیں، بار بار کرنا چاہیے۔ عبدالسمیع صاحب نے ان کو بہت سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں اس تنبیہ کے ساتھ کہ اس میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے جس کو وہ اگلے ایڈیشن میں درست کر لیں گے۔

○○○

بقیہ: شبنم نقوی کی شاعری: ایک جائزہ

صفحہ ۸ سے آگے

اسے کوئی خود سے منسوب کر سکتا تھا۔ اس کا امکان بھی باقی نہیں، اس کو پڑھنے کے بعد وہ شاعری یاد آ جاتی ہے جس میں عاشق معشوق کو احساس دلانا چاہتا ہے کہ ہم کسی کے پابند نہیں ہیں۔

جو ہمیں محسوس کرنے ہم ہی کے پاس ہیں ایک آفاقی سچائی ہے۔ شعر کا سارا حسن محسوس کرنے میں ہے۔ تیسرے شعر میں پیاس کا ذکر ہے، عام طور پر پیاس کے ساتھ پانی یا سیرابی کا لفظ آتا ہے۔

شبنم نقوی نے لفظ 'زندگی' کو تواتر کے ساتھ برتا ہے۔ اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ اس لفظ کے ساتھ زندگی کا معمولی اور عادی رویہ سامنے آ جاتا ہے۔ اور کبھی یہ لفظ کسی ایک شخص اور پہلو کا استعارہ بن جاتا ہے۔ ایک غزل کی ردیف 'زندگی' ہے:

زندگی خود آئینہ ہے وقت کا
وقت کے ہاتھوں میں آئینہ نہیں

تمام عمر کا ہم احتساب کر لیتے
یہ زندگی بھی جو ہوتی حساب کے مانند

زندگی آج بھی ہے زخمی سی
تیر ایسا وہ ایک کمان میں تھا

زندگی کی عجب ادا ہے آج
زندگی خود سے بھی خفا ہے آج

اب زندگی کے معنی و مطلب بدل گئے
اب زندگی کو خواب پریشاں کہے گا کون

عام طور پر وقت کو زندگی کا آئینہ کہتے ہیں۔ یہاں زندگی کو آئینہ کہا گیا ہے۔ اس طرح وقت پر زندگی کو برتری حاصل ہے۔ برتری کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وقت ٹھہر گیا ہے اور زندگی رواں دواں ہے۔ قصہ یہ ہے کہ وقت ایک طرح سے زندگی کا استعارہ بھی ہے اور زندگی بھی وقت کا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وقت ہی سب کچھ ہے، زندگی تو اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ لیکن شاعر زندگی کی تضاد پذیری کے باوجود دعویٰ کرتا ہے کہ وقت کو آئینہ زندگی ہی دکھا سکتی ہے۔ دوسرے شعر میں زندگی کا جو کردار ابھرتا ہے وہ بہت توجہ طلب ہے۔ زندگی میں کون کس کو حساب دے سکتا ہے اور یہ بھی کہ انسان ایک نظام سے بندھا ہوا ہے۔ ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی سے زندگی کا حساب مانگ رہے ہیں یا ہم خود ہی حساب دے رہے ہیں۔ لیکن بہت بعد کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم تمام عمر زیاں کا سودا کرتے رہے۔ جو لوگ زندگی کو حساب کی طرح دیکھتے یا سمجھتے ہیں انھیں دیکھنے کا حق ہے اس لیے کہ یہ دنیا تو سب کے لیے ہے۔ عرفان صدیقی نے ایک مختلف بات کہی تھی:

مجھے یہ زندگی نقصان کا سودا نہیں لگتی
میں آنے والی دنیا کو بھی تخمینے میں رکھتا ہوں

اس شعر سے یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ متکلم اس دنیا کو کاروباری شے تصور کرتا ہے۔ تخمینہ میں رکھنا اور زندگی کو نقصان کے سودا سے بلند سمجھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں کوئی پوری طرح اپنا اندوختہ بچا نہیں سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انسان نقصان کا تخمینہ لگا لے۔ تخمینہ میں کم یا زیادہ کی گنجائش تو رہتی ہی ہے۔ زندگی آج بھی زخمی سی کیوں ہے اس کا سبب ظاہر ہے کہ زخم دینے والے کی اس ... میں مہارت ہی ہو سکتی ہے۔ تیر تو کمان ہی سے نکلتا ہے۔ یہاں حسن کا پہلو کمان کے 'اک' تیر میں پوشیدہ ہے، اس زندگی کا رشتہ کسی خاص عہد سے بھی نہیں ہے اور نہ کچھ تیر اور کمان ہی کسی خاص وقت کا ہے۔ چوتھے شعر میں ایک ذرا سی بات ہے زندگی کا خود سے خفا ہو جانا۔ اور اسے ایک ادا کہنا۔ ردیف 'آج' نے زندگی کی اس ادا کو عصری بنا دیا ہے۔ اسی لیے پڑھنے والے کا ذہن عصر حاضر کے مختلف مسائل و میلانات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ زندگی کا خود سے خفا ہو جانا اس کی حد درجہ پریشاں حالی کی جانب اشارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اسباب داخلی ہی نہیں بلکہ خارجی بھی ہیں۔ اس سلسلے کا پانچواں اور آخری شعر جس میں خواب پریشاں کی ترکیب جگر کے شعر کی یاد تازہ کرتے ہیں:

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

شبنم نقوی کے شعر کا رشتہ جگر کے شعر سے قائم تو کیا جا سکتا ہے لیکن شبنم نقوی نے اظہار کی سطح پر اسے منفرد بنا دیا ہے۔ جگر کے یہاں آج کل میں جگر کا زمانہ شامل تھا۔ ایک خاص صورت حال میں جگر نے غزل گو شعرا کو شاعر نہ سمجھنے کی بات کہی تھی۔ فکر جمیل چوں کہ غزل کے ساتھ رہی ہے لہٰذا جب فکر جمیل ہی خواب پریشاں ہے تو غزل کا شاعر شاعر کیا ہوگا۔ شبنم نقوی نے اسے انفرادی طور پر تو دیکھا ہے مگر اجتماعی زندگی کا دکھ بھی اس میں شامل ہے۔ زندگی کے معنی و مطلب بدل چکے تو اس کے اسباب کیا ہیں، ظاہر ہے کہ غزل کے شعر میں اس کی تفصیلات نہیں بتائی جا سکتیں۔ شبنم نقوی نے خواب پریشاں کی ترکیب کو زندگی سے ماورا کر دیا ہے۔ جب زندگی کو ایک خاص نظر سے دیکھا جا رہا ہے تو ایسے میں زندگی خواب پریشاں کس طرح ہوگی، گویا زندگی خواب پریشاں کے باوجود خواب پریشاں نہیں ہے۔ یہی بنیادی فرق ہے جگر کے خواب پریشاں میں اور شبنم نقوی کے خواب پریشاں میں۔ وہ زندگی کو کچھ یوں بھی دیکھتے ہیں:

یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں شبنم
یہ زندگی ہے کہ ٹوٹی ہوئی سپر ہے کوئی

زندگی کو ٹوٹی ہوئی سپر کہنا ایک بصری پیکر کو ابھارتا ہے۔ میدان جنگ میں سپر ہی سے خود کو بچایا جا سکتا ہے، جب یہ ٹوٹ جائے تو زندگی کا لہولہان ہو جانا فطری ہے۔

میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ شبنم نقوی کسی ایک لفظ کی رعایت سے دوسرا لفظ لانے کی بے جا کوشش نہیں کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی بات کہنے میں زیادہ دل چسپی ہے نہ کہ رعایتیں قائم کرنے میں۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ رعایتوں کے ساتھ ہی بات کی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رعایتیں اب اس طرح قائم کرنا جیسا کہ کلاسیکی شاعری میں ہے، کوئی آسان نہیں، عصر حاضر کے بعض اچھے شعرا نے ان ہی رعایتوں کے سبب اپنے فطری انداز کو نقصان پہنچایا ہے۔ شبنم نقوی کے اس شعر میں 'وار' محض ایک جاب بیان بن گیا ہے:

پاس اپنے کوئی سپر بھی نہیں
وقت اچھا ہے وار کر تو لیں

اب ذرا مصحفی کا شعر دیکھیے:

جب اس نے تیغ چلائی ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

ہاتھ ہی یہاں سپر ہے۔ اردو غزل کی تاریخ میں مشکل ہی سے ایسا خوب صورت شعر تلاش کیا جا سکتا ہے۔ بعد کو غالب نے اس مضمون کو کہیں اور پہنچا دیا مگر اس کی فضا مختلف ہے:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

شبنم نقوی جب ذرا ہٹ کر سوچتے ہیں تو سادگی میں بھی ایک بات پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً:

زندگی کیا ہے کیا بتائیں تمھیں
ہاتھ سے روکنا بہاؤ کا ہے

شبنم نقوی کے اس مجموعے میں وہ اشعار بھی توجہ طلب ہیں جس کا رشتہ پیاس سے ہے:

عجب یہ امتحان تشنگی ہے
کہ پانی میں بھی اپنی پیاس رکھنا

کمال تشنگی کی انتہا ہوں
سمندر ہوں مگر پیاسا رہا ہوں

●●●

یادِ رفتگاں

شبنم نقوی کی شاعری

ایک جائزہ

'کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں' کی روشنی میں

ڈاکٹر سرور الہدیٰ (شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر نئی دہلی - 110025)
E-mail:sarwar103@gmail.com

'کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں' کے شاعر شبنم نقوی مرحوم نے مقدمے کے اختتام پر لکھا ہے: ''کچھ غمِ دوراں کچھ غمِ جاناں کا اگر ایک شعر بھی آپ کے دل کو چھوتا ہے تو میں کامیاب ہو گیا''۔ ایک اچھے شاعر کی بس اتنی ہی آرزو بھی قاری کے لیے ہمدردی کا سبب ہو سکتی ہے۔ اس جملے میں اوپری ہوئی خاکساری نہیں ہے بلکہ ایک فطری جذبہ ہے جس میں فن کارانہ احساس بھی ہے اور محاسبہ بھی۔ شاعر ذہن کی بات نہیں کرتا بلکہ دل کو چھونا اس کے لیے زیادہ اہم ہے۔ 'کچھ غمِ جاناں اور کچھ غمِ دوراں' کا نام اگرچہ بہت پرانا معلوم ہوتا ہے مگر بہت دنوں کے بعد غموں کی ایسی تقسیم نے متاثر کیا۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ آج بھی ہمارے شعرا زندگی کو اس طرح بھی دیکھتے ہیں، ورنہ تو اب کوئی غم نہ غمِ جاناں جیسا لگتا ہے اور نہ ہی غمِ دوراں جیسا۔ اب کچھ بھی خالص کہاں رہا ہے۔ ممکن ہے پہلے بھی خالص نہ رہا ہو اور ہم نے اپنے نظریے کو قوت پہنچانے کے لیے ایسی تقسیم کر لی ہو۔ اس مجموعے میں صرف ایک نظم ہے جو آخر میں 'کیا جواب دو گے تم، بابری مسجد کی تاریخی شہادت پر' کے عنوان سے شامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ پہلی مرتبہ شبنم نقوی کی یہ غزلیں میرے مطالعے میں آئی ہیں۔ ان کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ہیں جو دل کو بھی چھوتے ہیں اور دماغ کو بھی۔ وہ ان چند شعرا میں ہیں جنھوں نے بہت خاموشی کے ساتھ فکر و فن کی آبیاری کی ہے۔ ہر سنجیدہ اور حساس فن کار کو اپنی آس پاس کی دنیا متاثر کرتی ہے۔ اسے وہ ورثہ بھی بہت عزیز ہے جسے ہم مشترکہ تہذیبی روایت کا نام دیتے ہیں۔ اس تہذیبی روایت کو تحریک مذہب سے بھی ملتی ہے اور یہ سب کچھ مل کر ایک ایسی فکری دنیا تعمیر ہوتی ہے جس میں ماضی اور حال بعض اوقات ایک دوسرے کا عکس بن جاتے ہیں۔ شبنم نقوی کی غزلوں میں جہاں کہیں فطری طور پر یہ دنیا نمودار ہوتی ہے وہ ہماری توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ انھوں نے پہلے ہی صفحے پر ایک شعر نمایاں کر کے ہم تک پہنچایا ہے:

یقیناً اب کوئی ہے آنے والا
جہانِ دل میں سناٹا بہت ہے

کوئی شعر شاعر کو اچھا لگتا ہے اور اسے یہ گمان گزرتا ہے کہ دوسرے کو بھی یہ اسی طرح اپیل کرے گا۔ چوں کہ یہ شعر مجموعے کے آغاز میں درج ہے لہٰذا قاری کو رک کر اسے بھی پڑھنا پڑتا ہے۔ مجھے یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں کہ اسے کیوں اتنا اہم جان کر ہم تک بالکل شروع میں پہنچایا گیا۔ بہت سے مضامین قدیم اور رکی ہوتے ہیں مگر شاعر انھیں برتنا چاہتا ہے۔ کسی کی آمد کی خبر جہانِ دل کے سناٹے سے ملتی ہے۔ یہ ظاہر تو یہی لگتا ہے کہ بات بہت نئی اور متوجہ کرنے والی ہے۔ لیکن نئی غزل میں سناٹے اور دل کے سناٹے کے مضمون کو کچھ اس طرح باندھا گیا ہے کہ وہ مطالعے کا ایک اہم باب بن گیا ہے۔ شبنم نقوی کے یہاں ایک نہیں ایسے بہت سے اشعار ہیں جو روکتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ آپ ان سے سرسری طور پر گزر نہیں سکتے۔ خصوصاً وہ غزلیں جو چھوٹی بحر میں ہیں، چھوٹی بحر میں اچھے شعر کہنا ہمیشہ مشکل کام رہا ہے۔ شبنم نقوی نے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو کسی خارجی دباؤ کے تحت ممکن ہے دیکھا ہو مگر اب جو کچھ شاعری کی صورت میں سامنے آیا ہے وہ متاثر کرتا ہے۔ دوسری غزل کا ایک شعر سناٹے ہی سے متعلق ہے:

باہر باہر خاموشی ہے لیکن اس خاموشی میں
اندر اندر شور بپا ہو یہ بھی تو ہو سکتا ہے

اس شور اور خاموشی کو آپ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا نام کس طرح دیں گے۔ شبنم نقوی کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں اکثر اوقات ذات کا استعارہ بھی بن جاتا ہے۔ ان کا تخلیقی ذہن خاموشی کے ساتھ وجودی انسان کی طرح ذات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

بہت قریب سے اب خود کو دیکھتا ہوں میں
عجیب وقت ہے اپنے گریز پا ہوں میں

خود کو قریب سے دیکھنے اور خود کو پڑھنے کا مرحلہ آسان نہیں ہوتا۔ اسے خود احتسابی کی سزا کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنی ذات سے قربت بھی اچانک پیدا نہیں ہوتی۔ عجیب وقت ہے کا فقرہ کئی طرف ذہن کو لے جاتا ہے۔

کب اپنے آپ سے ٹوٹا تھا سلسلہ میرا
وہ آج مجھ کو ملا ہے تو سوچتا ہوں میں

اس شعر کی دنیا بہ ظاہر جتنی سادہ معلوم ہوتی ہے واقعتاً وہ اتنی ہے نہیں۔ کمال یہ ہے کہ اس میں نہ تو کوئی ترکیب سازی ہے اور نہ استعارہ بندی۔ کس طرح ایک ذات اپنی ذات کی بے خبری کا سبب بن جاتی ہے اور پھر معلوم نہیں ہوتا کہ زندگی میں ہم پر کہاں کیا گزری۔ کہاں ہم آدھے ادھورے رہ گئے اور کہاں بے خبری میں ہم نے اپنی تکمیلیت کا دعویٰ کر لیا۔ اس شعر کو یوں تو عشقیہ کہا جائے گا مگر اس میں وہ رومانیت نہیں جو پل بھر کے لیے نمو کرتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ متکلم کو خود نہیں معلوم کہ اس کی ذات کب اس سے جدا ہو گئی اور وہ جو تھا وہ نہیں رہا۔ 'وہ' کون ہے، کیا ہے جس کے اچانک مل جانے سے اسے اپنی ذات کے کہیں لوٹ جانے، کھو جانے کا احساس ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں قاری کے سوچنے کی تھیں۔ اتنی آسانی سے اس طرح کے شعر کہنا آسان نہیں۔ عموماً کسی شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے مضمون کو سجا سنوار کر باندھا ہے۔ اس سجانے اور سنوارنے کا بڑا تعلق لفظی رعایتوں اور مناسبتوں سے ہے۔ لیکن ان رعایتوں کے بغیر بھی شعر کو بنایا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ شبنم نقوی ان تمام فنی محاسن سے بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ پہلی قرأت میں اس کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان شعروں میں معنی کی کمی نہیں ہیں مگر ایک یا دو مصرعے تک ہماری رسائی ایک ذرا سے وقفے کے بعد ہوتی ہے۔ شبنم نقوی کا شعری مزاج سادہ بیانی سے قریب ہے۔

زندگی تیرے لیے کل بھی دیا تھا امتحاں
آج بھی گرتی ہوئی دیوار کے پاس ہیں
فاصلوں کی جو زباں ہو گیا کرتی ہے جان کے
جو نہیں محسوس کرتے ہم اسی کے پاس ہیں
یہاں وہ تاریخ ہے لکھے تو کیا کوئی قلم
خونچکاں جو داستانیں تشنگی کے پاس ہیں

پہلے شعر میں گرتی ہوئی دیوار کا ٹکڑا استعاراتی نوعیت کا ہے، لیکن اس کے لیے غیر ضروری طور پر مصرع اول میں امتحاں کے علاوہ کوئی اور لفظ نہیں لایا گیا ہے۔ مگر گرتی ہوئی دیوار زندگی کی پریشان حالی اور خوف کا اعلامیہ ہے۔ کل اور آج سے یہ بھی واضح ہے کہ متکلم زندگی کو یاد دلاتا ہے کہ تیرے لیے اس کے علاوہ اور میں کیا کر سکتا تھا۔ مصرع ثانی میں بھی اور ہی کا استعمال بڑا ہی بامعنی ہے۔ شعر کی داخلی صورت میں احتجاج بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر شعر کی فضا کم از کم دو نہیں پہلوؤں کی جانب ہمارے ذہن کو منتقل کرتی ہے۔

شبنم نقوی کا دوسرا شعر بھی توجہ طلب ہے۔ فاصلوں کی زبان کیا ہے یا کیا ہونی چاہیے اسے جاننا کیا ضروری ہے۔ ہجر اور وصال کا مضمون تو بہت عام سا ہے۔ شبنم نقوی کی خوبی یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی ندرت پیدا کر دیتے ہیں۔ مصرع اول میں ایک طنز بھی ہے اور بے نیازی بھی، مصرع ثانی کا بھی کمال کا ہے۔ ایک ایسا شخص جو کسی سے منسوب تھا یا

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: شمع آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org